عدالتی خلع پر فتوی کے مختلف رجحانات کا تنقیدی جائزہ

اشفاق احمد ۞

تمہید

خواتین کو درپیش مشکلات میں سے ایک اہم ترین مشکل ازدواجی زندگی کا درست طور پر استوار نہ ہونا بھی ہے۔ ازدواجی زندگی میں زوجین کے باہمی اختلافات بعض اوقات اس حد تک پہنچ جاتے ہیں کہ عورت کے لیے خاوند کے گھر رہنا دوبھر ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں اسلام میں عورت کے لیے خلع کا راستہ رکھا گیا ہے۔ دستوری حکومتیں بننے کے بعد کئی اسلامی ممالک میں اس حوالے سے قانون سازی بھی کی گئی۔ بعض اسلامی ممالک میں خلع کے متعلق بنائے گئے قوانین پر اہل علم کو شدید تحفظات ہیں اور ان کی نظر میں یہ قوانین مکمل طور پر غیر شرعی یا کم از کم اسلام کی روح سے ہم آہنگ نہیں، چناں چہ ابتدا میں جب اس نوعیت کی قانون سازی کی جارہی تھی تو عام طور پر مراکز فتوی نے قانون کی بنیاد پر عدالت سے لیے گئے خلع کو ناجائز قرار دیا، پھر رفتہ رفتہ عورتوں کی مشکلات اور مجبوریوں کو سامنے رکھتے ہوئے اس حوالے سے فتوی دینے کے کچھ اور رجحانات بھی سامنے آئے۔ زیر نظر مقالے میں اس حوالے سے فتوی کے مختلف رجحانات کا تنقیدی مطالعہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

عدالتی خلع

تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو خاندانی جھگڑے اور گھریلو ناچاقی کی صورت میں حاکم یا قاضی کی طرف رجوع کرنے کا رواج شروع اسلام ہی سے چلا آرہا ہے۔ اسلام کی تاریخ میں گھریلو جھگڑے کی وجہ سے علاحدگی کے مطالبے کا جو سب سے پہلا کیس درج ہوا، وہ حضرت ثابت بن قیسؓ کی زوجہ کا ہے۔ نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد خلفاے راشدین کے دور میں بھی عورتیں گھریلو ناچاقیوں کی شکایات لے کر آتی تھیں اور حسب حال بعض اوقات خلع کے فیصلے بھی کیے گئے، جیسا کہ آگے بعض واقعات کی تفصیل آئے گی۔ یوں خلع کے لیے عدالتی یا حکومتی مدد لینے کا تصور نیا نہیں، بلکہ ابتداے اسلام سے ہی ہے۔ بعض ائمہ اور تابعین کے نزدیک خلع صرف عدالت کے ذریعے ہی

۞ ایم فل اسکالر، شریعہ اکیڈمی، بین الاقوامی اسلامی یونی ورسٹی، اسلام آباد۔(ishfaq_iiui@yahoo.com)

حاصل کیا جاسکتا ہے۔[۱] بیسویں صدی عیسوی میں جب دستوری حکومتیں بننے لگیں تو بیشتر اسلامی ممالک میں خاندانی قوانین وضع کیے گئے جن میں خلع کے قوانین میں عام طور پر خلع کے معاملے کو عدالت کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا کہ عدالت اگر یہ سمجھے کہ زوجین حدود اللہ کی رعایت رکھتے ہوئے اپنے حقوق ادا نہیں کر سکتے تو ان کے درمیان خلع کا فیصلہ کر دے خواہ خاوند راضی نہ ہو۔ یہاں سے علمی حلقوں میں اس بحث کا آغاز ہو گیا کہ عدالت کی طرف سے اگر زوجین میں سے کسی ایک کی رضامندی کے بنا خلع کا فیصلہ کر دیا جائے تو کیا وہ شرعی طور پر معتبر بھی ہو گا یا نہیں۔

پاکستان میں قانون خلع

ہمارے ہاں خلع کے متعلق باقاعدہ کوئی قانون وضعی موجود نہیں؛ لیکن چونکہ آئین کی رو سے ملک میں قرآن و سنت سے متصادم کوئی قانون نہیں بن سکتا، اس لیے ۱۹۶۲ء کے مسلم پرسنل لا میں طلاق کے ضمن میں خلع کو بھی ان سولہ معاملات میں شامل کیا جاسکتا ہے جن میں قرآن و سنت کے مطابق فیصلہ کیا جائے گا۔[۲] چناں چہ شروع میں عدالتیں معروف حنفی فقہی تصور کے مطابق خلع کے مقدمات میں زوجین کی رضامندی کے بغیر خلع کا فیصلہ صادر نہیں کرتی تھیں۔ قیام پاکستان سے پہلے ۱۹۴۵ء میں لاہور ہائی کورٹ نے عمر بی بی بنام محمد دین کے مقدمے میں واضح طور پر فیصلہ دیا کہ عورت شوہر کی رضامندی کے بغیر خلع نہیں کرا سکتی۔[۳] پھر ۱۹۵۲ء میں سعیدہ خانم بنام محمد مسیح کے مقدمے میں بھی عدالت نے یہی فیصلہ دیا کہ خاوند کی رضامندی کے بغیر خلع کا فیصلہ نہیں کیا جاسکتا۔[۴] ۱۹۵۹ء میں پاکستان میں پہلی بار لاہور ہائی کورٹ کے تین جج صاحبان نے بلقیس فاطمہ بنام نجم الاکرام کے مقدمے میں پہلی بار یہ فیصلہ دیا کہ اگر عدالت تحقیق کے ذریعے اس نتیجے تک پہنچ جائے کہ زوجین حدود اللہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے تو عدالت شوہر کی رضامندی کے بنا ہی خلع کا فیصلہ کر سکتی ہے۔[۵] بعد ازاں ۱۹۶۷ء میں سپریم کورٹ کے معزز جج صاحبان جسٹس ایس اے رحمان، جسٹس فضل اکبر، جسٹس حمود

۱۔ ابو بکر احمد بن علی الرازی الجصاص، **أحكام القرآن** (لاہور، سہیل اکیڈمی)، ۱: ۳۹۵۔

2- Act 1962 West Pakistan Muslim Personal Law (Shariat Application)

۳ – عمر بی بی بنام محمد دین۔ اے۔ آئی۔ آر ۱۹۴۵ء لاہور ۵۱۔

۴ – سعیدہ خانم بنام محمد سمیع۔ پی ایل ڈی ۱۹۵۲ء۔ لاہور ۵۱۔

۵ – بلقیس فاطمہ بنام نجم الاکرام۔ پی ایل ڈی ۱۹۵۹ء لاہور ۵۶۔

الرحمن، جسٹس محمد یعقوب علی اور جسٹس ایس اے محمود نے بھی خورشید بیگم بنام محمد امین کے مقدمے میں اسی نقطہ نظر کو اختیار کیا۔[۶] سپریم کورٹ کے اس فیصلے نے بعد ازاں ماتحت عدالتوں کے لیے قانون کی حیثیت اختیار کر لی اور ۱۹۶۷ء کے بعد سے ہماری عدالتیں خلع کے فیصلے اپنی صواب دید پر عورت کے حق میں کرنے لگیں۔ ۲۰۰۲ء میں خلع کے مقدمات کو عدالت میں تیز رفتاری سے نمٹانے کے لیے قانون میں یہ ترمیم کی گئی کہ عدالت زوجین کو مصالحت کا موقع دے اور مصالحت کی ناکامی کی صورت میں عدالت لازمی طور پر عورت کے حق میں خلع کا فیصلہ کر دے، خاوند کی رضامندی ضروری نہیں۔[۷]

عدالتی خلع کی شرعی حیثیت

پاکستان میں ۱۹۶۷ء میں سپریم کورٹ کے فیصلے کے بعد اور عرب ممالک میں عائلی مسائل میں نئی قانون سازی کے بعد پوری اسلامی دنیا کے علمی حلقوں میں یہ سوال اٹھا کہ آیا اگر عدالت زوجین میں سے کسی ایک کی رضامندی کے بغیر دوسرے کے حق میں خلع کا فیصلہ کر دے تو کیا وہ خلع شرعاً معتبر ہو گا یا نہیں؟ اور کیا اس کے بعد بیوی کے لیے کہیں اور نکاح کرنا صحیح ہو گا؟ چناں چہ اس سلسلے میں مراکز افتا کی طرف سے چار طرح کی آرا سامنے آئیں، جنھیں یہاں اس حوالے سے فتوی دینے کے چار رجحانات سے تعبیر کیا گیا ہے۔

فتوی کے رجحانات

اس وقت عدالتی خلع کے حوالے سے دنیا میں فتوی دینے کے درج ذیل چار اہم رجحانات ہیں:

۱۔ مطلقاً جواز

۲۔ مطلقاً عدم جواز

۳۔ عدم جواز مع فسخ نکاح

۴۔ مالکی مذہب پر فتوی دینا

ذیل میں بالترتیب چاروں رجحانات کی تفصیل بیان کر کے ان کا تنقیدی جائزہ لیا جائے گا۔

۶۔ خورشید بیگم بنام محمد امین۔ پی ایل ڈی ۱۹۶۷ء سپریم کورٹ ۹۷۔

7. section 10 ,The west Pakistan Family courts Act 1964.

پہلا رجحان: مطلقاً جائز

عدالتی خلع کے بارے میں فتوے کا ایک رجحان یہ ہے کہ عدالت اگر اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ میاں بیوی آپس میں ایک دوسرے کے حقوق شریعت کے مطابق سرانجام نہیں دے سکتے اور زوجین کے درمیان خلع کا فیصلہ کر دے تو فیصلے کے بعد بطور قضاے قاضی خلع متحقق ہو جائے گا، خواہ خاوند کی رضامندی شامل ہو یا نہ ہو۔ اصولی طور پر عدالت میں آکر بیوی کا یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ مجھے اس خاوند سے اس قدر بغض اور نفرت ہے کہ اس کے ساتھ رہنا ناممکن ہے۔ فتوے کا یہ رجحان زیادہ تر عرب ممالک میں ہے۔(۸) پاکستان میں اہل حدیث مراکز افتا بھی عام طور پر خلع میں فتویٰ کے سلسلے میں اسی رجحان کے حامل ہیں۔(۹)

بطور نمونہ ایک استفتا اور اس کا جواب درج ذیل ہے:

استفتا

میری معلومات کی حد تک خلع میں خاوند کی رضامندی ضروری ہے کہ جب تک وہ رضامند نہ ہو خلع نہیں ہوتا جبکہ ملکی قانون کی رو سے اگر عدالت خاوند کی رضامندی کے بنا بھی خلع کا فیصلہ کر دے تو وہ معتبر سمجھا جاتا ہے۔ پوچھنا یہ ہے کہ جب خاوند خلع پر رضامند نہ ہو اور عدالت خلع کا فیصلہ کر دے تو بیوی کے لیے کیا حکم ہے؟ کیا وہ کسی اور سے نکاح کر سکتی ہے؟

جواب:

اس کے جواب میں مفتی عبد العزیز بن بازؒ خلع کی مشروعیت کی حکمت اور بلاوجہ خلع مانگنے کی شناعت بیان کرنے کے بعد فتوی دیتے ہوئے رقم طراز ہیں:

۸۔ اس سلسلے میں ملاحظہ ہوں مرکز الفتوی السعودي اور دارالإفتاء اردن و مصر وغیرہ کے فتاوی:

http://fatwa.islamweb.net/fatwa/index.php?page=showfatwa&Option=FatwaId&Id=137038

http://aliftaa.jo/Questions.aspx?Id=185

http://www.dar-alifta.org/ar/ViewCategory.aspx?ID=16

۹ – تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: حافظ عبد اللہ روپڑی، **فتاوی اہل حدیث** (سرگودہا: ادارہ احیاے سنت نبویہ)،۲: ۵۲۲–۵۲۳؛ عبد الستار حماد، **فتاویٰ اصحاب الحدیث** (لاہور: مکتبہ اسلامیہ)،۲: ۳۲۱۔

جب میاں بیوی کی باہمی ناچاقی اس حد تک پہنچ جائے کہ حقوق شریعت کی عدم ادائیگی کا خوف ہو تو ان کے لیے بالاتفاق خلع لینا جائز ہے۔۔۔ جب عورت قاضی کی عدالت میں خلع کا مقدمہ لے کر پہنچ جائے اور قاضی خلع کا فیصلہ کر دے تو خلع ہو جائے گا اور عقد نکاح ختم ہو جائے گا۔ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے اجنبیوں کی طرح ہو جائیں گے، کیوں کہ قاضی خلع کا فیصلہ تب ہی کرتا ہے جب اس کے سامنے کوئی سبب موجود ہوتا ہے گو کہ وہ سبب عورت کا یہ کہنا ہی کیوں نہ ہو کہ اسے اپنے خاوند سے نفرت ہے اور وہ اس کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ دوسری بات یہ کہ جب بیوی اس انتہا تک پہنچ گئی ہے کہ معاملے کو عدالت میں کھینچ لائی ہے اور قاضی سے اپنے اور خاوند کے درمیان علاحدگی کا مطالبہ کر رہی ہے تو ظاہر سی بات ہے کہ اسے خاوند سے بغض ہے اور اسے خاوند کے ساتھ رہنا ناپسند ہے۔ اس ساری صورت حال کے بعد اس بات میں کیا حکمت رہ جاتی ہے کہ خاوند ایک ایسی عورت کو اپنے پاس دبا کر رکھے جو اسے ناپسند کرتی ہے، کیا یہ مقصود شریعت کے خلاف نہیں، جب کہ شریعت نے زواج کو جائے سکون اور رحمت و محبت قرار دیا ہے۔ (۱۰)

دوسرا رجحان: مطلقاً عدم جواز

عدالتی خلع کے سلسلے میں فتویٰ دینے کا دوسرا رجحان یہ ہے کہ مروجہ عدالتی خلع چوں کہ جمہور ائمۂ متقدمین میں سے کسی کے ہاں بھی جائز نہیں، اس لیے خلاف شریعت ہے اور عدالت کی تفریق سے میاں بیوی کے رشتے پر کوئی فرق نہیں پڑے گا اور عورت کے لیے کہیں اور نکاح کرنا جائز نہیں ہوگا؛ چناں چہ **فتاویٰ دارالعلوم دیوبند** کے باب الخلع میں عدالتی خلع کے متعلق ایک استفتا کے جواب میں یہ ہی فتویٰ دیا گیا ہے۔ مستفتی کے سوال کی عبارت کچھ یوں ہے:

استفتا

زید کی زوجہ منکوحہ اگر زید سے بوجہ تکلیف نان و نفقہ یا زدوکوب بلا ضرورت یا طبعاً ناراض اور متنفر ہو اور کسی طرح زید کے نکاح میں رہنا پسند نہ کرے اور اپنا مہر معاف کر کے طلاق چاہتی ہو اور اس کا شوہر کسی طرح ضداً طلاق نہ دیتا ہو اور ایذا رسانی عمل میں لاتا ہو، ایسی صورت میں شرعاً زن منکوحہ کو قید نکاح سے آزادی دلوائی جا سکتی ہے یا نہیں؟ نیز عورت کی اولاد (عمر ڈیڑھ سال) جو زید سے ہو وہ زید کو دلوائی جا سکتی ہے یا عورت کو؟

جواب

یہ صورت خلع کی ہے کہ عورت اپنا مہر معاف کر دے اور شوہر طلاق دے دے۔ ایسی حالت میں کہ باہم زوجین میں تنفر ہے، یہ ضروری ہے کہ خلع ہو جائے مگر خلع ہو یا طلاق شوہر کی رضامندی کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا اور شرعاً ایسی کوئی

۱۰۔ عبدالعزیز ابن باز، **مجموع فتاویٰ**، حکم إلزام الزوج بالخلع ،الخميس، ۱۳/ رمضان ۱۴۳۰ھ / ۳/ ستمبر ۲۰۰۹ء، فتویٰ نمبر: ۱۲۶۲۵۹ (جدہ: دار القاسم للنشر، ۱۴۲۰ھ)، ۲۱: ۲۵۹۔

صورت نہیں ہے کہ بدون طلاق دینے شوہر کے یابدون خلع کرنے کے عورت اس کے نکاح سے خارج ہو جائے۔ پس جس طرح ہو شوہر کو مجبور کیا جائے کہ خلع کرلے یا طلاق دے دے۔ اگر ویسے نہ مانے تو بذریعہ حاکم ایسا کرایا جائے یعنی حاکم شوہر کو مجبور کرے کہ یا وہ نان نفقہ دے اور زوجہ کی خبر گیری کرے ورنہ خلع کرلے یا طلاق دے دے۔[۱۱]

اسی طرح عدالتی خلع کے متعلق ایک استفتا کے جواب میں **احسن الفتاوی** میں مفتی رشید احمد لدھیانوی لکھتے ہیں:

اس نوعیت کے جو سوالات بھی ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں خلع اور فسخ نکاح کو ایسا خلط ملط کر دیا جاتا ہے کہ گویا یہ دونوں ایک ہی ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ خلع اور فسخ نکاح دونوں بالکل الگ الگ ہیں۔ خلع ایک عقد ہے جو دوسرے عقود بیع، اجارہ اور نکاح وغیرہ کی طرح جانبین کی کامل رضامندی پر موقوف ہے۔ خلع کے لیے عدالت جانے کی ضرورت نہیں بلکہ زوجین اپنے طور پر اپنی صواب دید کے مطابق عوض خلع متعین کر کے معاملہ کر سکتے ہیں۔ یہ الگ بحث ہے کہ شوہر کے لیے کن صورتوں میں عوض لینا جائز ہے اور عوض کی کتنی مقدار کا جواز ہے۔ اس تفصیل سے قطع نظر جس صورت میں اور جتنی رقم پر بھی جانبین نے معاملہ طے کر لیا وہ نافذ ہو جائے گا۔ عدت گزرنے پر دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

اگلی چند سطور میں فسخ نکاح اور اس کی شرائط کی وضاحت کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ اس پر امت مسلمہ کے تمام مجتہدین کا اجماع ہے کہ خلع زوجین کی باہمی رضامندی پر موقوف ہے، حاکم خلع پر مجبور نہیں کر سکتا۔ اس پر مذاہب اربعہ کے علاوہ اہل ظاہر کا بھی اتفاق ہے۔[۱۲]

برصغیر کے زیادہ تر مراکز افتا اور بعض عرب مفتیان کرام کا بھی یہی رجحان ہے۔

تیسرا رجحان: عدم جواز مع فسخ نکاح

اس سلسلے میں فتوی دینے کا تیسرا رجحان یہ ہے کہ یہ بات تو طے شدہ ہے کہ موجودہ صورت حال میں عدالتی خلع اسلامی تعلیمات کے مطابق نہیں اور خلع کے اسلامی تصور اور رشتہء ازدواج کی حکمت کے یکسر الٹ ہے، لیکن دوسری طرف یہ بھی امر واقع ہے کہ ایسی خواتین کی تعداد کم نہیں جو واقعتاً مجبور ہیں۔ خاوند کے ناروا سلوک کی وجہ سے یا کسی عیب کی وجہ سے اس کے ساتھ گزارا کرنا ان کے بس سے باہر ہو جاتا ہے۔ خاوند مطالبے کے باوجود نہ طلاق دینے پر آمادہ ہے نہ خلع دینے پر راضی ہوتا ہے اور اپنا رویہ بدلنے کے لیے بھی تیار نہیں۔ اس طرح کی سنگین

۱۱۔ مجموعۂ مصنفین، **فتاوی دارالعلوم دیوبند**، کتاب الطلاق، باب الخلع (کراچی: دارالاشاعت)، ۱۰: ۱۷۷۔

۱۲۔ مفتی رشید احمد، **احسن الفتاوی**، کتاب الطلاق، باب الخلع (کراچی: ایچ ایم سعید کمپنی، ۱۴۲۵ھ)، ۵: ۳۸۳۔

صورت حال میں عورت کے پاس عدالت جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں ہوتا۔ چناں چہ اگر ایسی صورت حال ہو کہ عورت واقعتاً مجبور ہو تو اولاً اسے چاہیے کہ وہ عدالت میں خلع کی بجائے فسخ نکاح کی درخواست دائر کرے، لیکن اگر خلع کی درخواست کی گئی ہو اور عدالت یک طرفہ خلع کا فیصلہ کر دے تو اس میں دیکھا جائے کہ کسی بھی مذہب کے مطابق اگر کوئی سبب فسخ پایا جارہا ہے تو حکم حاکم رافع للخلاف کی بنیاد پر اس عدالتی فیصلے کو بطور فسخ نکاح معتبر قرار دیا جائے گا۔

اس سلسلے میں جامعہ دارالعلوم کراچی کی طرف سے جاری ایک فتوے میں کہا گیا ہے:

بیوی کے لیے ضروری ہے کہ وہ درخواست برائے فسخ نکاح نان ونفقہ نہ دینے کی بنیاد پر دے اور جج اپنے فیصلے میں اسی کو بنیاد بنائے، خلع کا طریقہ کار ہر گز اختیار نہ کرے اس لیے کہ یک طرفہ خلع شرعاً کسی کے نزدیک بھی جائز اور معتبر نہیں تاہم اگر کسی فیصلے میں بنیادِ فیصلہ فی الجملہ صحیح ہو، یعنی شوہر کا تعنت ثابت ہو رہا ہو، البتہ عدالت نے فسخ کے بجائے خلع کا طریقہ اختیار کیا ہو اور خلع کا لفظ استعمال کیا ہو تو ایسی صورت میں خلع کے طور پر تو یک طرفہ فیصلہ درست نہ ہو گا، تاہم فسخ نکاح کی شرعی بنیاد پائے جانے سے اس فیصلے کو معتبر قرار دیں گے اور یہ سمجھا جائے گا کہ اس فیصلے کی بنیاد پر نکاح فسخ ہو گیا ہے اور عورت عدت طلاق گزار کر کسی دوسری جگہ اگر چاہے تو نکاح کر سکتی ہے، بشرطیکہ فیصلہ مذکورہ بالا شرائط اور طریقہ کار کے مطابق ہو۔ (۱۳)

علما اور مفتیانِ کرام کے نام دارالافتاء جامعہ دارالعلوم کراچی سے جاری کردہ ایک تحریر میں اس خلع کے مسئلے میں خواتین کی مشکلات کا حل نکالنے کے لیے کئی تجاویز دی گئی ہیں جن میں سے ایک تجویز مندرجہ بالا طریق کار کو اپنانے کی ہے اور دوسری تجویز یہ دی گئی ہے کہ بعض تابعین یعنی حسن بصری، ابن سیرین، سعید بن جبیر اور زیاد رحمہم اللہ تعالیٰ کی اس رائے کو اختیار کر لیا جائے جس کی رو سے خلع سلطان یا قاضی ہی کرے گا۔۔۔اور اگر زوجین یا دونوں میں سے کوئی ایک خلع پر راضی نہ بھی ہو تو تب بھی سلطان یا قاضی کو تفریق اور خلع کا اختیار حاصل رہے گا۔ (۱۴)

اسی طرح جامعۃ العلوم الاسلامیۃ بنوری ٹاؤن کراچی کے دارالافتا کے رفیق مفتی محمد عبدالقادر عدالتی خلع سے متعلق استفتا کے جواب میں تحریر کرتے ہیں:

۱۳۔ مفتی محمد تقی عثمانی، **فتاوی عثمانی** (کراچی: مکتبہ معارف القرآن، ۱۴۲۷ھ / ۲۰۰۶ء)، ۲: ۴۶۱-۴۶۳۔

۱۴۔ مفتی محمد عصمت اللہ، فتوی مرقومہ ۱۴۲۷ھ / ۴ / ۴ (کراچی، دارالافتاء دارالعلوم)۔

یک طرفہ طور پر تنسیخ نکاح کا فیصلہ کرنے سے شرعاً نکاح ختم نہیں ہو گا اور نہ ہی شرعاً عورت آزاد ہو گی، کیوں کہ شوہر کے عدالت میں حاضر نہ ہونے کی مختلف وجوہات ہو سکتی ہیں مثلاً شوہر کو صحیح طور پر اطلاع نہ ملی ہو کہ جس پتے پر سمن بھیجا گیا ہو وہ اس پتے پر موجود نہ تھا اور نہ ہی اس نے اخباری اطلاع کی خبر پڑھی یا اطلاع ملنے کے باوجود اس تصور سے عدالت میں حاضر نہیں ہوا کہ چونکہ کیس عدالت میں پہنچ چکا ہے لہذا عدالت میں جانا نہ جانا برابر ہے، کیوں کہ فیصلہ عام طور پر عورت کے حق میں ہوتا ہے، اس لیے شوہر کا عدالت میں حاضر نہ ہونا شرعی طور پر عورت کے الزامات درست ہونے پر حجت نہیں۔ عورت کی طرف سے عائد کردہ الزامات حقیقت پر مبنی ہوں فرضی نہ ہوں کہ اگر عورت شوہر کے خلاف جھوٹے الزامات عائد کر کے جھوٹے گواہوں کے ذریعے گواہی پیش کر کے عدالت سے اپنے حق میں فیصلہ کرالیتی ہے تو اس صورت میں اگرچہ ظاہری شرائط اور تقاضے ہونے کی بنا پر فیصلہ عورت کے حق میں نافذ العمل ہو جائے گا، مگر دیانتاً اور عند اللہ یہ فیصلہ غلط ہو گا اور اس پر عمل کرنا ناجائز ہو گا۔۔۔ اگر عدالتی فیصلے کی کارروائی سے فسخ نکاح سے متعلق دیگر تمام شرائط اور تقاضے پائے جائیں، خاص کر شرعی گواہوں سے عورت کی جانب سے عائد کردہ الزامات درست ثابت ہو جائیں تو پھر عدالتی فیصلہ شرعاً قابل اعتبار قرار دیا جانا چاہیے، صرف لفظی غلطی سے فسخ نکاح کے دعوے کی جگہ خلع کا لفظ استعمال کیا گیا اور فیصلے میں فسخ نکاح کی جگہ خلع لکھا گیا، اس بنا پر اسے غیر معتبر قرار نہیں دیا جانا چاہیے۔[(۱۵)]

یہی بات دارالافتا جامعہ غوثیہ رضویہ سکھر کی طرف سے جاری کردہ ایک مفصل فتوے میں ان الفاظ میں کہی گئی ہے لیکن اس میں فیصلے کے نفاذ کے لیے نوے دن کی بات کی گئی ہے:

اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ اعجاز احمد نہ خود کورٹ میں حاضر ہوا، نہ اس نے کوئی وکیل کیا، تو بھی لڑکی کی طرف سے بیان کیے گئے اعذار مبرہنہ ہونے کی صورت میں کورٹ کے یک طرفہ خلع (جو کہ جو در اصل تنسیخ نکاح ہے) کے نفاذ کا حکم دیا جائے گا، جس کا نوے (۹۰) دن کے بعد اطلاق ہو گا اور زوجین کے مابین رشتہء ازدواج ختم ہو جائے گا۔
واضح رہے بایں صورت یہ خلع نہیں، بلکہ فسخ نکاح ہو گا، جو کہ معدود صورتوں میں اعذار شرعیہ کے پائے جانے کی صورت میں نافذ العمل ہے۔ جو کہ کورٹ کی اصطلاح میں لفظِ خلع سے معبرّ ہے۔[(۱۶)]

چوتھا رجحان: مالکیہ کے مذہب کو اختیار کرنا

چوتھا رجحان یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں جہالت اور احکام شرع سے بے خبری اور اس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں ظلم و ستم اور اختلاف عام ہے، ان حالات میں زیادہ بہتر یہ ہے اس مسئلے پر فقہائے مالکیہ کی

۱۵۔ **ماہنامہ بینات**، فتوی مرقومہ ذوالحجہ ۱۴۱۵ھ، ۲۰۱۶/۹/۲۴ (کراچی: جامعہ علوم اسلامیہ بنوری ٹاؤن)،
http://www.banuri.edu.pk/readquestion

۱۶۔ محمد ابراہیم القادری، رئیس دارالافتاء، فتوی مرقومہ ۲۰۱۴ء/۱۱/۲۵ (سکھر: الجامعۃ الغوثیۃ الرضویہ)۔

رائے کو اختیار کرتے ہوئے عدالتی فیصلوں کو درست قرار دیا جائے۔ یہ رجحان معاصر اہلِ علم میں مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (انڈیا) اور مولانا مفتی محمد زاہد (پاکستان) کا ہے۔(۱۷)

مفتی محمد زاہد کے نزدیک اگر میاں بیوی میں ناچاقی ہو اور بیوی اس کی بنیاد پر تفریق کی طلب گار ہو، لیکن وہ خاوند کی طرف سے کسی زیادتی کو ثابت بھی نہ کر سکے، تو اس کے لیے خاوند سے خلاصی کی کوئی قانونی صورت ممکن ہے؟ اس بارے میں فقہ حنفی اور شافعی کے مطابق اس کے لیے یہی راستہ ہے کہ وہ خاوند کو طلاق دینے یا باہمی رضامندی کے ساتھ خلع کرنے پر آمادہ کرے اور کوئی عدالتی چارہ نہیں؛ البتہ مالکیہ کے مذہب اور حنابلہ کی ایک روایت کے مطابق ایک خاص طریقِ کار اور کارروائی کے بعد عورت کے لیے بذریعہ قانون خاوند کی رضامندی کے بغیر بھی خلاصی کی صورت ممکن ہے۔(۱۸)

خلاصی کی صورت بیان کرتے ہوئے مفتی محمد زاہد لکھتے ہیں:

اگر زوجین میں اختلاف ہو جائے اور یہ پتا چلانا مشکل ہو کہ قصور وار کون ہے یا عورت خاوند کی طرف سے ظلم و زیادتی اور ضرر کا بار بار دعوی اور شکایت کرے، لیکن اس پر گواہ اس کے پاس موجود نہ ہوں، تو قاضی انھیں قابلِ اعتماد نیک لوگوں کے درمیان ٹھہرائے گا، تاکہ وہ ان کے حالات کا جائزہ لے کر عدالت کو حقیقتِ حال سے آگاہ کریں اور عدالت اس کے مطابق اصلاحِ احوال کے لیے مناسب کارروائی کرے۔ اس سے بھی اگر نزاع ختم نہ ہو تو قاضی فریقین کی طرف سے ایک

۱۷۔ محمد زاہد، **عدالتی تفریق** (اسلام آباد: شریعہ اکیڈمی، ۲۰۱۴ء)، ۲۷؛ مولانا خالد سیف اللہ رحمانی لکھتے ہیں: "خلع کے سلسلے میں ایک اہم مسئلہ یہ ہے کہ اس میں قاضی اور عدالت کے اختیارات کیا ہوں گے؟ کیا خلع مکمل طور پر مرد ہی کے اختیار میں ہے اور اس کی آمادگی اور رضامندی پر ہی موقوف ہے یا خصوصی حالات میں قاضی کو دخیل ہونے کا بھی کچھ حق ہے؟۔۔۔ اس سلسلے میں فقہا کی آرا مختلف ہیں: امام ابو حنیفہؒ کے ہاں یہ اختیار مکمل طور پر مرد ہی کے ہاتھ میں ہے۔ قاضی خود یا قاضی کی طرف سے مقرر کیے ہوئے حکم بطور خود عورت کو طلاق نہیں دے سکتے۔ اس کے بر خلاف امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک قاضی زوجین کے حد سے گزرے ہوئے باہمی اختلاف کی صورت میں ایک دو رکنی مصالحتی کمیٹی قائم کرے گا جس میں بہتر ہے کہ ایک مرد کا رشتہ دار ہو اور دوسرا عورت کا، دونوں سمجھ دار اور شرعی احکام سے واقف ہوں، پھر وہ ان دونوں کے حالات کا جائزہ لیں۔ اگر مصالحت اور اتفاق کی کوئی صورت نکل آئے تو دونوں میں مصالحت کرا دیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے اور دونوں کی رائے ہو کہ باہم تفریق اور علاحدگی کرا دی جائے تو ایسا بھی کر سکتے ہیں؛ اس طرح کہ مرد کا رشتہ دار حکم طلاق دے دے اور عورت کا رشتہ دار حکم مہر معاف کر دے یا جو معاوضہ مناسب سمجھے عورت کو اس کی ادائی کا پابند کرے اور دونوں میں تفریق ہو جائے۔" خالد سیف اللہ رحمانی، **جدید فقہی مسائل** (کراچی: زم زم پبلشرز، ۲۰۱۰ء)، ۳: ۱۲۴-۱۲۹۔

۱۸۔ محمد زاہد، مصدر سابق۔

ایک حکم (ثالث) مقرر کرے گا، یعنی ایک ثالث خاوند کی طرف سے اور ایک بیوی کی طرف سے۔ یہ دونوں ثالث بھی اپنی طرف سے اصلاحِ احوال اور نباہ کی صورت پیدا کرنے کی پوری کوشش کریں گے، لیکن اگر وہ اس نتیجے پر پہنچیں کہ دونوں میں نباہ مشکل ہے اور دونوں کے درمیان علاحدگی ہی میں مصلحت ہے تو وہ دونوں ثالث زوجین اور قاضی کی مرضی کے بغیر تفریق بھی کرسکتے ہیں۔[۱۹]

یہاں سوال یہ ہے کہ پاکستان کے تناظر میں اس طریق کار کا کس طرح اعتبار کیا جائے گا؟ مفتی محمد زاہد کے نزدیک اس حوالے سے چوں کہ ہمارے ہاں نہ تو مدون قانون میں اور نہ ہی اعلیٰ عدلیہ کے زیرِ عمل فیصلوں میں نچلی عدالتوں کو مذکورہ بالا طریقے سے ثالث مقرر کرنے کا پابند کیا گیا ہے اور نہ عملاً یہ عدالتیں عموماً دو ثالث مقرر کرتی ہیں، اس پہلو سے اگر دیکھا جائے تو یہ فیصلے شقاق کی مذکورہ بالا تفصیل پر پورے نہیں اترتے، لیکن اسی کے ساتھ یہاں ایک دوسرا پہلو بھی اہم اور قابلِ غور ہے اور وہ یہ کہ مذکورہ بالا حکم کی اصل روح یہ ہے کہ جب اس بات کا یقین ہو جائے کہ زوجین میں نباہ ممکن نہیں رہا اور مصالحت کی کوششیں ناکام ہو چکی ہیں تو ان کو اکٹھے رہنے پر مجبور کرنے کے بجائے ان میں تفریق کی جاسکتی ہے۔ اس بات کا جائزہ لینے کے لیے کہ مصالحت کی کوئی صورت ممکن ہے یا نہیں؟ معیاری طریقہ تو یہی ہے کہ دو ثالث ہوں، لیکن جیسا کہ پہلے مالکیہ کی عبارات کے حوالے سے گزرا کہ ایک ثالث پر بھی اکتفا کیا جاسکتا ہے۔ جب جج کسی اور شخص کو ثالث مقرر کرسکتا ہے تو خود بھی یہ ذمے داری انجام دے سکتا ہے[۲۰]۔ نیز عدالتی فیصلہ جاری ہونے کے بعد یونین کونسل میں جاتا ہے جہاں کونسل کو پابند کیا گیا ہے کہ وہ تیس دن کے اندر اندر مصالحت کی کوشش کرے اور اس کے لیے ہر ممکن کوشش کرے۔ اگر یونین کونسل مصالحت میں ناکام ہو جائے اور سرٹیفکیٹ جاری کردے تب عدالتی فیصلہ نافذ العمل ہوتا ہے۔[۲۱]

دلائل

پہلے فریق کے دلائل

جو حضرات عدالتی خلع کے مطلقاً جواز کا فتویٰ دیتے ہیں ان کے دلائل درج ذیل ہیں:

۱۹۔ محمد زاہد، مرجع سابق۔

۲۰۔ محمد زاہد، مرجع سابق، ۳۳۔

۲۱۔ محمد زاہد، "مقامی کونسلوں کا ایک انتہائی مگر نظر انداز شدہ کردار"، **تجزیات**، اسلام آباد (۲۰۱۶ء)، ۷۶: ۱۴- ۱۹۔

(الف) ان حضرات کی پہلی دلیل یہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ﴾[۲۲] (اگر تمھیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے تو ان دونوں کے لیے اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ عورت مالی معاوضہ دے کر علاحدگی حاصل کر لے۔) سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس آیت میں ارشاد باری تعالیٰ فإن خفتم میں حکام اور قاضیوں کو خطاب کیا گیا ہے کہ اگر وہ اس بات کا اندیشہ محسوس کریں کہ زوجین اللہ تعالیٰ کی حدود کو اپنے مابین قائم نہیں رکھ پا رہے تو عورت سے خاوند کو کچھ رقم فدیہ لے کر ان کے درمیان تفریق کر دی جائے۔

(ب) ان کی دوسری دلیل حضرت ثابت بن قیسؓ کی زوجہ کا واقعۂ خلع ہے، جس میں نبی کریم ﷺ نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو فرمایا کہ طلقها یعنی اسے طلاق دے دو۔ یہاں پر طلقها امر کا صیغہ ہے اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے جب تک ایسا کوئی قرینہ نہ پایا جائے جس سے دوسرا معنی مراد لیا جاسکے۔ دوسری بات یہ کہ نبی کریم ﷺ نے حضرت ثابت کو جو یہاں پر طلاق دینے کا حکم دیا ہے وہ بحیثیت قاضی اور حاکم ہے، نبی اور مرشد کی حیثیت سے نہیں، کیوں کہ اگر یہ بات ہوتی تو نبی کریم ﷺ کا انھیں طلاق کا حکم نہ دیتے، بلکہ پہلے مشاورت فرمالیتے کہ کیا اس بات سے راضی ہیں یا یوں کہتے اگر چاہو تو طلاق دے دو۔ آپ کا براہ راست طلاق کا حکم دینا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آپ کا یہ حکم لازمی تھا اور حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کے لیے اس میں کوئی اختیار نہیں تھا کہ اگر وہ راضی ہوں تو تبھی طلاق دیں، بلکہ ان کے لیے ہر دو صورتوں میں عمل کرنا ضروری تھا۔ اس لیے اگر قاضی مقدمے کا جائزہ لینے کے بعد اس نتیجے پر پہنچ جائے کہ زوجین کے درمیان تفریق ہی معاملے کا واحد حل ہے تو اسے تفریق کر دینی چاہیے، خاوند راضی ہو یا نہ ہو۔[۲۳]

فریق ثانی کے دلائل

یہ حضرات بھی ارشاد باری تعالیٰ: ﴿فَاِنۡ خِفۡتُمۡ اَلَّا يُقِيۡمَا حُدُوۡدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيۡهِمَا فِيۡمَا افۡتَدَتۡ بِهٖ ؕ﴾[۲۴] سے ہی استدلال کرتے ہیں؛ ان کا استدلال دو طرح سے ہے:

۲۲۔ القرآن ۲: ۲۲۹۔

۲۳۔ ابن باز، **مجموع الفتاوی**، ۲۱: ۲۶۰۔

۲۴۔ القرآن ۲: ۲۲۹۔

۱- اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے خلع کے معاملے میں میاں بیوی دونوں کو برابر کا شریک قرار دیا ہے؛ چناں چہ مولانا یوسف لدھیانوی لکھتے ہیں: ہر شخص کھلی آنکھوں دیکھ رہا ہے کہ قرآنِ کریم کی اس آیتِ مقدسہ نے (جس کو "آیتِ خلع" کہا جاتا ہے) خلع کے معاملے میں اوّل سے آخر تک میاں بیوی دونوں کو برابر کے شریک قرار دیا ہے، مثلاً: اِلَّآ اَنْ یَّخَافَا (اِلّا یہ کہ میاں بیوی دونوں کو اندیشہ ہو)، اَلَّا یُقِیْمَا (وہ دونوں قائم نہیں کر سکیں گے اللہ تعالیٰ کی حدود کو)، فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا یُقِیْمَا (پس اگر تم کو اندیشہ ہو کہ وہ دونوں خداوندی حدود کو قائم نہیں کر سکیں گے)، فَلَا جُنَاحَ عَلَیْھِمَا (تب ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں)، فِیْمَا افْتَدَتْ بِہٖ (اس مال کے لینے اور دینے میں، جس کو دے کر عورت قیدِ نکاح سے آزادی حاصل کرے)۔

اس پوری آیت میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں جس سے یہ معلوم ہو جس طرح طلاق مرد کا انفرادی حق ہے، اسی طرح خلع عورت کا انفرادی حق ہے جس میں شوہر کی مرضی و نامرضی کا کوئی دخل نہیں۔[۲۵]

۲- دوسرا یہ کہ اس آیت میں فلاجناح علیھما فیما افتدت کے الفاظ بھی اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ شوہر اور بیوی کی رضامندی ضروری ہے۔ زوجین کے خلع پر راضی ہو جانے کے بعد ان میں سے ہر ایک کو شبہہ ہو سکتا تھا کہ پیسے دے کر طلاق حاصل کرنا شاید جائز نہ ہو اور مرد کو یہ شک گزر سکتا تھا کہ طلاق پر پیسے وصول کرنا گناہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے فلاجناح علیھما کے الفاظ سے دونوں کا شبہ دور فرما دیا، بلکہ ان الفاظ میں شوہر کی رضامندی کا مفہوم اور زیادہ واضح ہے؛ اس لیے کہ معاملہ خلع کے گناہ ہونے کا زیادہ شبہ مرد کو ہی ہو سکتا ہے، کیوں کہ وہ پیسے وصول کرنے والا ہے، بخلاف عورت کے کہ وہ پیسے ادا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ اسی آیت میں آگے فیما افتدت بہ کے الفاظ بھی قابل غور ہیں۔ اس میں بدل خلع کو فدیہ اور عورت کی ادائی کو افتداء کہا گیا ہے اور بقول ابن قیم یہ خود اس بات کی دلیل ہے کہ خلع ایک عقد معاوضہ ہے جس میں فریقین کی باہمی رضامندی ضروری ہے، اس لیے کہ فدیہ عربی زبان میں اس مال کو کہا جاتا ہے جو جنگی قیدی چھڑانے کے لیے پیش کیا جاتا ہے۔ اس مال کو پیش کرنا

۲۵- محمد یوسف لدھیانوی، "خلع کی شرعی حیثیت اور ہمارے عدالتی طریقے کا رخ"، **ماہنامہ بینات**، کراچی (ربیع الثانی ۱۴۳۲ھ / اپریل ۲۰۱۱ء)، ۴: ۴: ۶۔

افتداء اور قبول کرنا فداء کہلاتا ہے اور یہ بالاتفاق عقد معاوضہ ہوتا ہے جس میں فریقین کی رضامندی ضروری ہوتی ہے اور کوئی فریق دوسرے کو مجبور نہیں کر سکتا۔[۲۶]

(ب) دوسری دلیل وہی حضرت ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی زوجہ کا واقعہ ہے جسے دلیل کے طور پر فریق اول نے پیش کیا ہے۔ یہ حضرات ثابت بن قیسؓ کی زوجہ کے قصے میں أتردین علیه حدیقته (کیاتم اسے اس کا باغ واپس کردوگی) اور أقبل الحدیقة و طلقها تطلیقة (باغ واپس لے لو اور اس کو ایک طلاق دے دو) سے استدلال کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر خلع زوجین کی آپس کی رضامندی کے بغیر ہوتا تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں سے سوال جواب ہی نہ کرتے اور خود ہی تفریق کر دیتے۔ بقول امام جصاص رحمۃ اللہ علیہ[۲۷] اگر یہ اختیار حاکم کو ہوتا کہ جب وہ دیکھے کہ زوجین، حدود اللہ کو قائم نہیں کریں گے تو ان کے درمیان خلع کا فیصلہ کر دے، خواہ زوجین خلع کو چاہیں یا خلع سے انکار کریں تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ان دونوں سے اس کا سوال ہی نہ فرماتے اور نہ شوہر سے یہ فرماتے کہ اس کو خلع دے دو، بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم خود خلع کا فیصلہ دے کر عورت کو مرد سے چھڑا دیتے اور شوہر کو اس کا باغ لوٹا دیتے، خواہ وہ دونوں اس سے انکار کرتے یا ان میں سے ایک فریق انکار کرتا؛ چناں چہ لعان میں زوجین کے درمیان تفریق کا اختیار چوں کہ حاکم کو ہوتا ہے، اس لیے وہ لعان کرنے والے شوہر سے نہیں کہتا کہ اپنی بیوی کو چھوڑ دو، بلکہ از خود دونوں کے درمیان تفریق کر دیتا ہے۔[۲۸] نیز نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان بطور مشورہ تھا نہ کہ حکم[۲۹] معلوم ہوا کہ اس واقعے میں شوہر کی مرضی کے بغیر خلع کا یک طرفہ فیصلہ نہیں فرمایا گیا، بلکہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شوہر کو مشورہ دیا کہ اس سے باغ واپس لے کر اس کو طلاق دے دیں۔[۳۰] ان کی تیسری دلیل

۲۶- محمد تقی عثمانی، **اسلام میں خلع کی حقیقت** (کراچی: میمن اسلامیک پبلشرز)، ۱۹- ۲۴۔

۲۷- ابو بکر احمد بن علی الرازی الجصّاص (۳۰۵- ۳۷۰ھ) ، مفتی، مجتہد مذہب حنفی اور کئی کتابوں کے مصنف تھے۔ ابواسحاق شیرازی شافعی کہتے ہیں بغداد میں فقہ حنفی کی تعلیمی سند آپ تک پہنچتی ہے اور آپ سے ہمارے (شافعی) فقہا نے کسبِ فیض کیا۔ ابواسحاق الشیرازی، **طبقات الفقهاء** (بیروت: دار الرائد العربي)، ۱: ۱۴۴۔

۲۸- الجصاص، **أحكام القرآن**،۱:۳۹۵۔

۲۹- حافظ ابن حجر، **فتح الباري** (بیروت: دار الصادر)، ۹: ۳۹۷۔

۳۰- محمد تقی عثمانی، مرجع سابق، ۴۲۔

اجماع امت ہے۔ ائمۂ اربعہ اور ظاہریہ سمیت تمام ائمہ اس پر متفق ہیں کہ خلع خاوند کی رضامندی کے بغیر ممکن نہیں۔ (۳۱)

تیسرے فریق کے دلائل

ان کی دلیل یہ ہے کہ سلطان یا قاضی کا یک طرفہ طور پر خلع کا فیصلہ کرنا اجتہادی مسئلہ ہے، اجماعی نہیں اور اجتہادی مسائل میں اصول ہے کہ "حُكْمَ الْحَاكِمِ فِي مَسَائِلِ الاِجْتِهَادِ يَرْفَعُ الْخِلَافَ" (۳۲) (اجتہادی مسائل میں حاکم / قاضی کا فیصلہ اختلاف ختم کر دیتا ہے) لہٰذا موجودہ دور کی ضرورت کی وجہ سے اس بات کی گنجائش محسوس ہوتی ہے کہ اگر عدالتی فیصلے میں کوئی مجتہد فیہ سبب فسخ پایا جارہا ہے، تو یہ فرض کر کے کہ عدالت نے دوسرے مذہب کی رائے کو اختیار کر لیا ہے اس کو جائز قرار دے دیا جائے۔

چوتھے فریق کے دلائل

یہ حضرات کہتے ہیں کہ نکاح کے مقاصد اور فلاسفۂ اسلام نے خلع کی جو روح اور حکمت بتائی ہے وہ بھی اس سے مطابقت رکھتی ہے جو امام مالک کا مسلک ہے۔ موجودہ زمانے میں جو صورت حال ہے اگر اس کو سامنے رکھا جائے تو درج ذیل وجوہ سے مالکیہ کا مذہب قوی محسوس ہوتا ہے:

(الف) ارشاد باری تعالیٰ: ﴿وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا﴾ (اگر تم کو ان دونوں کے درمیان شدید اختلاف کا اندیشہ ہے تو ایک ایک حکم مرد و عورت کے خاندان سے بھیجو۔ اگر دونوں اصلاح حال چاہیں گے تو اللہ تعالیٰ ان دونوں کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ تمام باتوں سے باخبر اور واقف ہے۔) میں متعدد قرائن ایسے ہیں جو امام مالک کے موقف کی تائید کرتے ہیں:

۱۔ اول یہ کہ اس آیت کے مخاطب قاضی اور حکام ہیں اور کئی تابعین کی یہی رائے ہے اور قرآن کے لب ولہجے سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اب ظاہر ہے کہ قاضی اور حاکم کی حیثیت واعظ اور محض اخلاقی اپیل کرنے والے ناصح کی نہیں ہے، بلکہ اس کا منصب یہ ہے کہ جو لوگ وعظ و نصیحت کی زبان سمجھنے پر آمادہ نہ ہوں ان کے لیے قانون اور اختیارات کی تلوار استعمال کی جائے، لہٰذا اگر قاضی کے مقرر کردہ

۳۱۔ **فتاوی دار العلوم دیوبند**، ۱۰: ۱۷۷؛ مفتی رشید احمد، **احسن الفتاوی**، ۵: ۳۸۳

۳۲۔ ابوالعباس القرافی، أنوار البروق في أنواء الفروق (بیروت: عالم الكتب)، ۲: ۱۰۳۔

حکمین کو قانونی اختیار حاصل نہ ہو تو قرآن کا قاضی کو مخاطب بنانا اور قاضی ہی کی طرف سے حکمین کا تقرر ایک بے معنی بات ہو گی۔ اس لیے قضاۃ اور حکام سے خطاب بجائے خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس مسئلے میں قاضی کے نمائندے کو فیصلہ کن حیثیت حاصل ہونی چاہیے کہ وہ چاہے تو مصلحت کرا دے یا اپنی صواب دید پر علاحدگی کر دے۔

۲- قاضی کے بھیجے ہوئے ان نمائندوں کے لیے قرآن نے حکم کا لفظ استعمال کیا ہے۔ حکم کے معنی خود حکم اور فیصلہ کرنے والے کے ہیں۔ اب اگر اس کی حیثیت محض طرفین کے وکیل کی ہو اور وہ ان کے احکام کا پابند ہو تو وہ حکم اور فیصل کہاں باقی رہا۔ اس تعبیر کا یہ تقاضا بھی ہے کہ وہ تفریق اور مصالحت کے معاملے میں خود مختار ہوں گے۔

۳- قرآن نے یہاں إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا کہا ہے۔(اگر حکمین ان دونوں میں مصالحت کرانا چاہیں) یہاں حکمین کی طرف ارادے اور چاہنے کی نسبت کی گئی ہے اور ایسی بات اسی کے بارے میں کہی جا سکتی ہے جو کسی کام کے کرنے اور اس کے خلاف اقدام کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔ جو شخص کسی کا وکیل ہو وہ ارادہ اختیار کا مالک نہیں ہوتا۔ وہ بہر صورت خاص اسی حکم کا پابند ہوتا ہے۔

(ب) احادیث

وہ احادیث جو اس مسئلے میں قاضی کے مختار ہونے کو بتلاتی ہیں:

۱- امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کی بیوی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کی: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم مجھے ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے دین اور اخلاق سے کوئی شکایت نہیں، لیکن مجھے یہ بات بھی پسند نہیں کہ مسلمان ہو کر کسی کی ناشکری کروں۔ یعنی ایک طرف ثابت کا میرے ساتھ اچھا سلوک ہے اور دوسری طرف میرا ان کی طرف طبعی رجحان نہیں، جس کے باعث میری طرف سے ان کی ناقدری ہوتی ہے، اس لیے ہم دونوں میں علاحدگی کر دی جائے۔ آپ نے فرمایا کیا تم اس کو اس کا باغ لوٹا دو گی؟ انھوں نے کہا "ہاں"۔ آپ

ﷺ نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے فرمایا: اقبل الحديقة وطلقها تطليقة کہ باغ لے لو اور اس کو طلاق دے دو۔[۳۳]

اور ایک روایت کے الفاظ یوں ہیں أمرہ ففارقها کہ حضور ﷺ نے ان کو حکم دیا لہٰذا انھوں نے بیوی کو علاحدہ کر دیا۔ امام بخاری کی ایک اور روایت اور نسائی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا نام جمیلہ بنت عبد اللہ تھا۔

اس حدیث میں واقعہ کا یہ پہلو بہت قابل غور ہے کہ حضور ﷺ نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ سے اپیل نہیں کی نہ مشورہ کیا، بلکہ طلاق دینے کا حکم فرمایا۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ قاضی مرد کی رضامندی اور آمادگی معلوم کرنے کا پابند نہ ہو گا، بلکہ حسب ضرورت اس کو اپنی صواب دید پر نافذ کرے گا۔ اب اس کے نافذ کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ خود مرد اس بات کے لیے تیار ہو جائے اور طلاق دے دے، جیسا کہ اس واقعہ میں ہوا یا پھر قاضی خود علاحدہ کر دے۔

۲- دوسرا واقعہ بھی حضرت ثابت ہی کا ہے جسے ابو داؤد نے سیدنا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے نقل کیا ہے کہ حبیبہ بنت سہل رضی اللہ عنہا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کے نکاح میں تھیں۔ ثابتؓ نے حبیبہ رضی اللہ عنہا کو اس قدر مارا کہ ان کا کوئی عضو ٹوٹ گیا۔ حبیبہؓ حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور شوہر کی شکایت کی۔ آپ نے ان کو بلایا اور فرمایا کہ حبیبہؓ کے مال میں سے کچھ لے کر اسے رہا کر دو۔ ثابت بن قیسؓ نے دریافت کیا: کیا یہ درست ہو گا؟ آپ ﷺ نے فرمایا ''ہاں''۔ ثابتؓ نے کہا میں نے اس کو دو باغ دیے ہیں جو اسی کے قبضے میں ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا اس کو لے لو اور حبیبہؓ کو چھوڑ دو (خذهما وفارقها) چناں چہ ثابت نے ایسا ہی کیا۔[۳۴] ابن ماجہ کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حبیبہ بنت سہلؓ کو اصل میں ان کی شکل وصورت سے کراہت تھی اور یہ ناپسندیدگی اس درجہ تھی کہ، ان کے الفاظ میں، اگر خدا کا خوف نہ ہوتا تو جیسے وہ داخل ہوئے تھے ان کے منہ پر تھوک دیتی: والله لولا مخافة الله إذا دخل علي لبصقت

۳۳- **صحيح البخاري**، باب الخلع ،كيف الطلاق فيه (رياض: دار ابن جوزی)، ۲: ۷۹،رقم: ۵۲۷۳۔

۳۴- ابو داؤد سلیمان بن اشعث السجستانی،**سنن أبي داؤد**، باب في الخلع (مصر: دارالرسالة،۲۰۰۹ء)،۳: ۵۵۴، ،رقم: ۲۲۲۷۔

في وجهه[۳۵] ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کی بیویوں حبیبہ اور جمیلہ دونوں ہی کو اصل شکایت ثابتؓ کی شکل وصورت ہی سے تھی، جیسا جمیلہؓ کا بیان گزر چکا ہے کہ مجھے ان کے دین واخلاق سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ البتہ ہو سکتا ہے کہ اس ناپسندیدگی کی وجہ سے حبیبہؓ سے کوئی ایسی نافرمانی کی بات سرزد ہوگئی ہو جس نے ثابتؓ کو مشتعل کر دیا ہو اور انھوں نے مارا ہو جس میں ان کے ہاتھ ٹوٹ گئے ہوں۔ اس واقعہ میں بھی آپ ﷺ نے ثابتؓ سے کوئی سفارش یا اپیل نہیں کی، ان سے طلاق پر رضامندی معلوم نہیں کی بلکہ حالات کو پیش نظر رکھ کر خود فیصلہ فرمایا کہ مہر کی رقم لے لے اور طلاق دے دے۔

(ج) آثار صحابہؓ

احادیث کے بعد آثار صحابہؓ پر نظر ڈالیے:

۱- اس نوعیت کا ایک واقعہ حضرت عثمان غنیؓ کے دور میں پیش آیا۔ ان کے زمانے میں عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور فاطمہ بنت عتبہ رضی اللہ عنہا (جو میاں بیوی تھے) کے درمیان اختلاف پیدا ہوا ہو گیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بحیثیت حکم بھیجا۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لأفرقن بينهما یعنی میں ضرور ان دونوں کے درمیان تفریق کر دوں گا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں عبد مناف کے دو بزرگ خاندانوں میں تفریق نہیں کر سکتا۔ (ما كنت لأفرقن بين شيخين من عبد مناف) یہاں تک کہ ان دونوں نے باہم خود ہی مصالحت کر لی۔[۳۶]

۲- اس سلسلے کا دوسرا واقعہ وہی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت کا ہے جس کا مجمل ذکر اس سے پہلے ہو چکا ہے۔ دار قطنی نے محمد بن سیرین کے واسطے سے صحیح سند کے ساتھ اس واقعے کی تفصیل ان الفاظ میں نقل کی ہے کہ ایک شوہر اور بیوی اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ حضرت علیؓ کی خدمت میں آئے۔ حضرت

۳۵- ابن ماجہ، **سنن ابن ماجه**، باب المختلعة (مصر: دار الرسالة، ۲۰۰۹ء)، ۳: ۲۰۸، رقم: ۲۰۵۷۔

۳۶- القرطبی، **الجامع لأحكام القرآن** (ریاض: دار عالم الكتب، ۲۰۰۹ء)، ۵: ۱۷۶۔ یہاں بھی حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کا بطور حکم کہنا کہ میں ان دونوں میں ضرور تفریق کروں گا، اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ حکم بحیثیت حکم خود ہی تفریق کے معاملے میں مختار ہوتا ہے۔ البتہ یہ ضروری ہوتا ہے کہ دونوں ہی حکم کسی ایک رائے پر متفق ہو جائیں۔

علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے شوہر اور بیوی ہر ایک کے خاندان میں سے ایک ایک حکم منتخب کیے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کو اپنی ذمے داری معلوم ہے؟ تمھاری ذمے داری یہ ہے کہ مناسب سمجھو تو دونوں میں علاحدگی کرادو۔ عورت نے کہا میں اللہ کی کتاب پر راضی ہوں چاہے اس کا فیصلہ میرے حق میں ہو یا میرے خلاف اور شوہر نے کہا جہاں تک علاحدگی کی بات ہے تو میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ (أما الفرقة فلا) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ تم بھی جب تک اس عورت کی طرح اقرار نہ کرلو یہاں سے جا نہیں سکتے۔

اس مقدمے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حکمین سے کہنا کہ "کیا تم اپنی ذمے داری سے واقف ہو، تمہاری ذمے داری یہ ہے کہ اگر تم چاہو تو علاحدگی کرادو۔" (هل تدريان ما عليكما؟ إن رأيتما ان تفرقا فرقتما) اس بات کی دلیل ہے کہ حکمین بحیثیت حکم تفریق کا اختیار رکھتے ہیں اور وہ اس کے ذمے دار ہیں۔ اگر ان کی حیثیت محض وکیل کی ہوتی تو سوال اس طرح ہوتا کہ کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم کس بات کے وکیل بنائے گئے ہو؟ (هل تدريان لماذا وكلتما؟) پھر یہ کہ خلع میں اگر ایک طرف مرد کی رضامندی ضروری ہوتی اور قاضی کو اس سلسلے میں کوئی اختیار نہ ہوتا تو یہ بات بھی درست نہ ہوتی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر طلاق کی آمادگی کے لیے کیسے دباؤ ڈال لیں؟ وہ زیادہ سے زیادہ سفارش اور اپیل ہی کرسکتے تھے۔

ان وجوہ کی بنا پر اس مسئلے میں امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے اور یہی رائے اکثر فقہا، اوزاعی، اسحاق، شعبی، نخعی، طاؤس، ابو سلمہ، ابراہیم، مجاہد اور امام شافعی کی ہے اور صحابہ میں بھی حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہم کا یہی مسلک نقل کیا گیا ہے۔[۳۷]

ہمارے زمانے میں جہالت اور احکام شرع سے بے خبری اور اس کی وجہ سے ازدواجی زندگی میں ظلم وستم اور اختلاف کی روشنی میں اگر اس مسئلے میں فقہاے مالکیہ کی رائے قبول کرلی جائے تو شاید مناسب ہو۔ ان امور کے علاوہ ہمارے فلاسفۂ اسلام نے خلع کی جو روح اور حکمت بتائی ہے وہ بھی اس سے مطابقت رکھتی ہے، جو امام مالک کا مسلک ہے۔[۳۸]

۳۷- سید السابق، **فقه السنة** (بيروت: دار الكتاب العربي، ۱۹۷۷ء) ۲ : ۲۷۶۔

۳۸ - خالد سیف اللہ رحمانی، **جدید فقہی مسائل**، ۳: ۱۲۴- ۱۲۹۔

چاروں رجحانات کا تنقیدی جائزہ

تمام فقہا، مجتہدین اور ارباب فتوی نے اپنے موقف پر بنیادی استدلال سورۂ بقرہ کی آیت فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللهِ۔۔۔الخ اور زوجہ ثابت بن قیس کے واقعہ ہی سے کیا ہے۔ طرز استدلال میں فرق کی وجہ سے مسئلے کی نوعیت میں بھی فرق پیدا ہو گیا۔ ذیل میں ہم چاروں رجحانات کے دلائل کا الگ الگ تنقیدی جائزہ لیتے ہیں:

پہلے رجحان کا جائزہ

الف۔ جہاں تک سورۂ بقرہ کی آیت میں فإن خفتم سے حکام یا قضاۃ پر استدلال کرنے کی بات ہے، تو اس میں شک نہیں کہ بہت سے مفسرین نے بھی حکام اور قاضی ہی مراد لیے ہیں، لیکن اگر مذکورہ آیت کے سیاق وسباق اور نکاح وطلاق سے متعلق دیگر آیات کو دیکھیں تو یہ احتمال تھوڑا مرجوح محسوس ہوتا ہے۔ اگر حکام مراد لے بھی لیے جائیں تو بھی خاوند کی موافقت وعدم موافقت کو بالکل یوں نظر انداز کر دینا کہ بیوی عدالت میں جا کر دعوی دائر کرے اور عدالت پہلے سے اس کے حق میں فیصلے کے لیے تیار بیٹھی ہو یہ بھی آیت کریمہ کا مقصود نہیں، کیوں کہ قاضی کو بہر حال اسی وقت متحرک ہونے کا حکم دیا گیا ہے جب واقعتاً یہ خوف محسوس ہو کہ زوجین اس انتہا تک پہنچ چکے ہیں کہ حدود اللہ کی رعایت رکھنا ان کے لیے ممکن نہیں اور یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کی باقاعدہ تحقیق ہو۔ اس لیے اس حد تک استدلال میں عموم کہ عورت کے دعوی کرنے کا مطلب ہی یہ فرض کر لیا جائے کہ قاضی کے لیے اللہ کی حدود کی پامالی کے خدشے سے تفریق کا حق ثابت ہو گیا ہے تو یہ آیتِ شقاق[۳۹] کے تقاضے کے خلاف ہے۔

ب۔ جہاں تک بات ہے حضرت ثابت بن قیسؓ کی زوجہ والے واقعے سے استدلال کی، تو اس میں اول تو یہ بات ہی محل نظر ہے کہ آپ ﷺ نے حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو طلاق دینے کی بابت جو ارشاد فرمایا تھا،

۳۹۔ " وَإِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوا حَكَمًا مِّنْ أَهْلِهِ وَحَكَمًا مِّنْ أَهْلِهَا إِن يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللهُ بَيْنَهُمَا " (القرآن ۴: ۳۵)۔

وہ بحیثیت قاضی تھا، جیسا کہ بعض محدثین نے تصریح کی ہے کہ محض مشورہ تھا۔[۴۰] اگر تسلیم کر بھی لیا جائے تو اگر اس قصے کی تمام روایات کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے اس سے قاضی کا یہ حق ثابت کرنا خاصا مشکل ہے کہ وہ خاوند کی رضامندی کے بغیر بھی خلع کا فیصلہ کر دے۔ مثلاً **سنن ابوداؤد** میں جو روایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے ہے اس کے الفاظ ہیں:"فدعا النبي ثابتا فقال خذ بعض مالها وفارقها، فقال أو يصلح ذلک يا رسول الله؟ قال نعم، قال فإني أصدقتها حديقتين وهما بيدها، فقال النبي خذهما وفارقها، ففعل"[۴۱] (نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابتؓ کو بلایا اور فرمایا کہ مال کا کچھ حصہ لے کر اس سے علاحدگی اختیار کر لو، انھوں نے عرض کی کیا یہ درست اور جائز ہو گا؟ آپ نے اثبات میں جواب دیا۔ اس پر ثابتؓ نے کہا کہ میں نے انھیں دو باغ بطور مہر دیے تھے جو کہ ان کی ملکیت ہیں۔ آپ نے فرمایا وہ لے لیں اور انھیں الگ کر دیں، چناں چہ انھوں نے ایسے ہی کیا۔) **سنن سعید بن منصور** کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے: "فلم يک شيء حتی جاء ثابت"[۴۲] (اس دوران میں اور کوئی بات نہیں ہوئی، یہاں تک کہ ثابت بھی آ گئے۔) **مصنف عبدالرزاق** کی ایک روایت میں ہے:

أن إمرأة كانت تحت ثابت بن قيس حديقةً وكان أصدقها وكان غيورا، فضربها فكسر يدها فجاءت النبي فاشتكت إليه فقالت : أنا أرد إليه حديقته، قال: أو تفعلين؟ قالت نعم، فدعا زوجها، فقال: إنها ترد عليك حديقتك، قال: أوَ ذلك لي؟ قال نعم، قال فقد قبلت يارسول الله، فقال النبيﷺ اذهبا فهي واحدة.[۴۳]

ایک خاتون جو ثابت بن قیس کی بیوی تھیں اور انھیں ثابت رضی اللہ عنہ نے نے بطور مہر ایک باغ دیا ہوا تھا اور وہ غیرت مند آدمی تھے۔ انھوں نے اس کو مارا جس کے نتیجے میں اس کا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس شکایت لے کر آئی اور عرض کی کہ میں انھیں

۴۰۔ محمد بن عبدالباقی الزرقانی، **شرح الزرقاني على الموطأ** (بیروت:داراحياء التراث العربي)،۳: ۲۵۵؛ بدرالدین العینی،**عمدة القاري**(بیروت: دارالكتب العلمية، ۲۰۰۱ء)، ۲: ۳۷۵۔

۴۱۔ **سنن أبي داؤد**،۳: ۵۴۵،۲۲۲۸۔

۴۲۔ ابو عثمان سعید بن منصور،**السنن**، باب في الخلع (بھارت،الدار السلفية،۱۹۸۲ء)،۱: ۳۷۸۔

۴۳۔ ابو بکر عبدالرزاق بن ہمام الصنعانی،**المصنف** (ہندوستان: المجلس العلمي، ۱۹۷۲ء) ،۶: ۴۸۲۔

ان کا باغ لوٹادوں گی۔ آپ نے فرمایا واقعی ایسا کروگی؟ تو اس نے اثبات میں جواب دیا۔ نبی کریم ﷺ نے ان کے خاوند کو بلایا اور فرمایا کہ یہ آپ کو آپ کا باغ واپس کر دے گی، انھوں نے عرض کی کہ کیا وہ میرے لیے جائز ہو گا؟ آپ نے اثبات میں جواب دیا۔ انھوں نے عرض کی یارسول اللہ مجھے قبول ہے، چناں چہ آپ نے فرمایا: ٹھیک ہے دونوں جاؤ، لیکن یہ اکیلی ہے اب۔

تفسیر قرطبی میں حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ایک اثر میں ہے:

أول من خالع في الإسلام أخت عبدالله بن أبي، أتت النبي صلى الله عليه وسلم فقالت: يا رسول الله، لا يجتمع رأسي ورأسه أبدا، إني رفعت جانب الخباء فرأيته أقبل في عدّة (تعني في جمع من الرجال) إذ هو أشدهم سوادا وأقصرهم قامة، وأقبحهم وجها! فقال: (أتردين عليه حديقته)؟ قالت: نعم، وإن شاء زدته، ففرق بينهما.[۴۴]

اسلام میں سب سے پہلا خلع عبد اللہ بن ابی کی بہن نے کیا تھا۔ وہ نبی ﷺ کے پاس تشریف لائیں اور عرض کی کہ یارسول اللہ میرا اور ثابت کا سر کبھی جمع نہیں ہو سکتا۔ میں نے پردے کی ایک جانب اٹھا کر لوگوں دیکھا تو وہ مجھے سخت کالے، کوتاہ قد اور سب سے بدصورت نظر آئے۔ آپ نے فرمایا کہ کیا انھیں ان کا باغ لوٹادو گی؟ اس نے عرض کی کہ جی ہاں اور اگر وہ زیادہ چاہے تو زیادہ کر دوں گی۔ چناں چہ آپ نے ان میں تفریق فرمادی۔

ان روایات سے واضح طور پر یہ معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم ﷺ کا طلاق دینے کا حکم جبری نوعیت کا نہیں تھا اور حضرت ثابت رضی اللہ عنہ نے مہر کی واپسی کے جواز پر اطمینان ہونے کے بعد ہی خلع پر رضامندی کا اظہار کیا۔ اگر یہ حکم بطور قضا کے یا وجوب کے ہوتا تو حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کی آمد اور پھر ان سے سوال وجواب کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ آپ ویسے ہی ان کی بیوی کی حد سے بڑھی ہوئی منافرت دیکھ کر فیصلہ فرما کر حضرت ثابت رضی اللہ عنہ کو مطلع فرمادیتے۔ نبی ﷺ کا ان سے باغ واپس لینے کے بدلے طلاق پر راضی ہونے کے بارے میں باقاعدہ سوال کرنا بتاتا ہے کہ آپ نے ان کی رضامندی کے پہلو کو ملحوظ رکھا ہے، کیوں کہ اگر ان کے اقرار اور انکار دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہی ہونا ہوتا تو یقیناً یہ سوال ہی نہ کیا جاتا۔

ج۔ تیسری دلیل یہ ذکر کی جاتی ہے کہ اگر خاتون اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کے لیے تیار نہیں اور صورت حال اس قدر بگڑ چکی ہے کہ معاملہ عدالت تک پہنچ گیا ہے، تو اب اس انتہا تک پہنچنے کے بعد بھی اس کو پابند بنانا کہ خاوند کی رضامندی حاصل کرو، مقاصدِ نکاح کے خلاف ہے، کیوں کہ مقصدِ نکاح تو زوجین کا ایک دوسرے کے لیے باہم تسکین کا ذریعہ ہونا ہے اور جب عورت کو خاوند کی شکل دیکھنا

۴۴۔ القرطبی، الجامع لأحكام القرآن، ۳: ۱۳۹۔

بھی گوارہ نہیں، تو کون سے مقصد نکاح کی تکمیل کے لیے اس کو ناپسندیدہ خاوند کے ساتھ رہنے پر مجبور کیا جائے۔

یہ بات یہاں تک تو واقعتاً درست ہے کہ زوجین کی آپس میں بیگانگی مقصد نکاح نہیں ہے، لیکن مقصد نکاح صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا، بلکہ اس کے ساتھ ادارۂ خاندان کی مضبوطی اور اس کو برقرار رکھنا بھی شامل ہے۔ لہٰذا اگر صرف اسی بات کو بنیاد بنا کر کہ عورت کا عدالت میں آنا ہی اس بات کی دلیل ہے کہ ان کے درمیان حسن معاشرت نہیں ہو سکتی، تفریق کر دینا اسلام کے خاندانی نظام کی بربادی پر منتج ہو گا، کیوں کہ مشاہدہ ہے کہ خانگی زندگی میں معمولی باتوں پر بعض اوقات خواتین جذباتی ہو کر طلاق یا جدائی کا مطالبہ شروع کر دیتی ہیں، اس لیے اگر ہر مقدمے میں فیصلہ عورت ہی کے حق میں ہو تو ایک نیا خاندان تو برباد ہو ہی گیا۔ جذباتیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ طلاق اور جدائی کا بھی فیصلہ ہو جانے کے بعد فریقین مراکز افتا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور بہت الحاح وزاری سے مفتی صاحب سے سوال کیا جاتا ہے کہ جناب غصے میں اور جذبات میں ہم سے یہ فیصلہ ہو گیا ہے، براہ مہربانی اب کوئی صورت نکالیں، چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ان کا کیا بنے گا؛ بطور مثال اس حوالے سے ایک استفتا ملاحظہ ہو:

جذبات میں لیے گئے خلع کے متعلق استفتا برائے نمونہ

کاشف مقام: کویت

السلام علیکم! میرا سوال یہ ہے کہ میں کویت میں ہوتا ہوں اور بیوی پاکستان میں ہوتی ہے۔ دو سال ہو گئے ہیں، میں بیوی سے نہیں ملا ہوں لیکن فون پر روزانہ بات چیت ہوتی ہے۔ دو سال پہلے بیوی سے کسی بات پر جھگڑا ہوا اور اس نے خلع لینے کا فیصلہ کیا، لیکن بات آئی گئی ہو گئی۔ ہم نارمل روٹین میں بات چیت کرتے رہے، لیکن اب میں نے پاکستان آنے کا پلان کیا، تو بیوی نے کہا کہ اس سے بہت بڑی غلطی ہو گئی کہ اس نے ایک سال پہلے عدالت سے خلع لیا اور عدالت نے فیصلہ اس کے حق میں کر دیا، لیکن اس بات کا کسی کو نہیں پتا ہے اور مجھے بھی ابھی اس نے بتایا ہے اور وہ یہ تسلیم کرتی ہے کہ جذباتی فیصلہ کر چکی ہے اور پچھتا رہی ہے۔ وکیل سے میری بیوی نے بات کی اور بہت سی باتیں وکیل نے خود بنا کر خلع کا کیس کر دیا اور عدالت نے لیٹر جاری کر کے مجھے بلایا، لیکن جس ایڈریس پر وکیل نے خط بھیجے وہ میرا ایڈریس نہیں تھا اور نہ مجھے پتا تھا کہ ایسا ہو رہا ہے اور فیصلہ میری بیوی کے حق میں کر دیا۔ میری بیوی کو بھی نہیں پتا تھا کہ یہ اتنا سنجیدہ ہو گا کیوں کہ فیصلہ اس نے تین مہینوں میں کر دیا اور گواہ میں صرف میری بیوی کے بھائی کے شناختی کارڈ کی کاپی ہے، اس کو بھی نہیں پتا اور نہ ہی اس نے بطور گواہ دستخط کیے یہ سب وکیل نے کیا۔ بیوی نے ڈر کے مارے کسی سے بات نہیں کی اور نہ ہی مجھے بتایا، لیکن اب میں آنے والا ہوں تو یہ بات اس نے مجھ سے کی۔ برائے مہربانی میری رہ نمائی فرمائیں کہ کیا اب بھی وہ میرے نکاح میں

ہے؟ یہ سب میری بیوی سے جذباتی فیصلہ ہوا۔ دو بچے ہیں بیٹا سات سال کا اور بیٹی پانچ سال کی۔ میرا گھر خراب ہو رہا ہے مجھے بتائیں کہ کیا اب وہ میری بیوی نہیں رہی، اولاد پر بہت برا اثر ہو گا، اور ہم دونوں بھی نہیں چاہتے کہ ہم الگ ہوں۔ (۴۵)

یہ اس نوعیت کا ایک استفتا نہیں، مراکز افتا میں اس طرح کے سوالات آئے دن آتے ہیں۔(۴۶) اس لیے محض عورت کے عدالت میں آکر منافرت کے اظہار کو ہی عدم حسن معاشرت کا سبب قرار دے کر علاحدگی کے فیصلے کو صحیح قرار دے دینا دلائل اور نتائج کے اعتبار سے درست معلوم نہیں ہوتا۔

دوسرے رجحان کا جائزہ

فتوے کے دوسرے رجحان میں عدالتی خلع کو مطلقاً ناجائز قرار دے کر خاتون خانہ کو دو ہی راستے بتائے جاتے ہیں: موت تک خاوند کے ساتھ ہی گزارہ کرے جس طرح بھی ہو، خواہ گھر جہنم ہی کیوں نہ بنا ہو بے چاری کے لیے، یا یہ کہ خاوند کو کسی طرح طلاق پر راضی کرے جس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہوتا ہے یا یہ کہ عدالت اسے مجبور کر کے خلع دینے پر آمادہ کرے، لیکن قانون نہ ہونے کی وجہ سے اس بات کا بھی کوئی عملی فائدہ نہیں ہوتا جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عورت بے چاری لٹک کر رہ جاتی ہے ؛نہ آگے کی ہوتی ہے اور نہ پچھلے خاوند کے ساتھ رہ سکتی ہے، لیکن کیا اس طرح کے فتاوی مقصد نکاح کی روح کے موافق ہیں؟ اس کا جواب یقیناً نفی میں ہے۔ مقاصدِ شریعت کی روشنی میں اگر دیکھا جائے تو شریعت کا ہرگز یہ مقصود معلوم نہیں ہوتا کہ ایک فریق یعنی خاوند کو تو ہر طرح سے اختیار ہو جب کہ دوسرا فریق بالکل ہی بے بس اور لاچار ہو اور ان حالات میں حدود اللہ کو کیسے قائم کیا جاسکتا ہے۔

جن دلائل پر اس موقف کی بنیاد ہے ان میں سے دو پر تو پہلے رجحان کے جائزے میں بات ہو چکی ہے اور اس سے یہ بات واضح ہے کہ ان آیات اور احادیث میں دونوں طرح کے ہی احتمالات ہیں اور اپنے مدلول پر ان کی

۴۵۔ دارالافتا جامعہ عالمیہ بنوریہ، کراچی، خلع کے مسائل، سوال نمبر: ۲۲۶۰۔

۴۶۔ چند سال پہلے جب فیملی کورٹس کی کارروائی دیکھنے اور مقدمات کی وجوہات کا جائزہ لینے کے لیے اسلام آباد کچہری میں جانے کا اتفاق ہوا، تو وہاں ایک وکیل صاحب کے پاس ایسے ہی مقدمے کی تیاری ہو رہی تھی جس میں بقول خاوند کے وہ ہر طرح سے بیوی کو اپنانے کے لیے تیار ہے، علاحدہ گھر بھی لے کے دینے کے لیے تیار ہے، لیکن بیوی کے میکے والے کوئی بات سننے کے لیے تیار ہی نہیں اور نہ بیوی سے ملنے دیتے ہیں اور اب خلع کا مطالبہ کر دیا ہے۔

دلالت قطعی نہیں جس کا دعویٰ دلائل میں کیا گیا ہے۔ اس نقطۂ نظر کی سب سے وزنی دلیل جسے باور کرایا جاتا ہے وہ "اجماع امت کا دعویٰ ہے" کہ سلف و خلف میں سے کسی کے نزدیک زوجین کی رضامندی کے بغیر خلع جائز نہیں۔

یہ دعویٰ دیکھنے میں جس قدر قوی محسوس ہوتا ہے حقیقت سے اسی قدر بعید ہے۔ اگر تو اجماعِ امت سے مراد حنفی فقہا کا اجماع ہے تو پھر درست ہے لیکن دیگر مسالک کے حوالے سے ایسا دعویٰ وہم کے سوا کچھ نہیں۔ مالکیہ میں سے کسی بھی قابل ذکر فقیہ نے ناچاقی کی صورت میں تفریق (خلع یا طلاق) کے سلسلے میں خاوند کی رضامندی کو ضروری نہیں قرار دیا۔[۴۷] **بداية المجتهد** میں ہے: "واختلفوا في تفريق الحكمين بينهما إذا اتفقا على ذلك هل يحتاج إلى إذن من الزوج أو لا يحتاج إلى ذلك فقال مالك وأصحابه يجوز قولهما في الفرقة والاجتماع بغير توكيل الزوجين ولا إذن منهما." [۴۸] (حکمین اگر زوجین میں تفریق پر متفق ہو جائیں تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے کہ خاوند کی اجازت ضروری ہو گی یا نہیں۔ امام مالک اور ان کے اصحاب کے نزدیک زوجین کی طرف سے اس امر (تفریق) کے وکیل اور مجاز بنائے بغیر ہی تفریق اور جمع کرنے کے سلسلے میں حکمین کا قول معتبر ہو گا)۔

تیسرے رجحان کا جائزہ

درحقیقت فتوی کے دوسرے، تیسرے اور چوتھے رجحان میں اس بات پر تو اتفاق ہے کہ خلع میں خاوند کی رضامندی ضروری ہے۔ اگر خاوند راضی نہ ہو اور حدود اللہ کے تقاضوں کے مطابق بیوی کے نباہ کی بھی کوئی صورت نہ ہو تو کیا کرنا چاہیے۔ دوسرے رجحان میں تو عورت کے لیے کوئی گنجائش نہیں چھوڑی گئی، جیسا کہ پیچھے گزر چکا ہے، جب کہ تیسرے اور چوتھے رجحان کی بنیاد ہی اس پر ہے کہ واقعتاً مجبور عورت کے لیے خلاصی کی صورت کیا

۴۷- تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: دیکھیے: مالک بن انس، **المدونة** (بیروت: دارالكتب العلمية، ۱۹۹۴ء)، ۲: ۲۶۷؛ قاضی عبدالوہاب البغدادی، **المعونة على مذهب عالم المدينة** (بیروت: دارالفکر)، ۲: ۸۷۵؛ ابن عبدالبر القرطبی، **الكافي في فقه أهل المدينة** (رياض: مكتبة الرياض الحديثة)، ۲:۵۹۲؛ حطاب رعینی، **مواهب الجليل** (بیروت: دار عالم الكتب)، ۵: ۲۶۵؛ تقی الدین الہلالی، **أحكام الخلع في الإسلام** (بیروت: المكتب الإسلامي)، ۱۲۔

۴۸- ابن رشد القرطبی، **بداية المجتهد** (بیروت: دارالفکر)، ۲: ۱۹۔

ہو سکتی ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس رجحان کے اختیار کرنے سے بہت سے مسائل حل ہوتے نظر آتے ہیں، لیکن یہاں دو مشکلات ہیں:

۱۔ وہ یہ کہ مقدمات اور فیصلہ جات کی ایک بڑی تعداد ایسی ہوتی ہے جن میں مقدمے اور فیصلے کی بنیاد کوئی مجتہد فیہ سببِ فسخِ نکاح نہیں ہوتا اور عورت مجبور بھی بہت ہوتی ہے۔ کچھ اسباب باطنی نوعیت کے ایسے بھی ہوسکتے ہیں جن کو خاتون خانہ صحیح طور پر تعبیر نہیں کر پاتی یا دوسرے بندے کے لیے تو کوئی زیادہ اہم نہ ہوں، لیکن بقول مولانا مودودی رحمۃ اللہ علیہ زندگی جہنم زار تو اس کی ہوتی ہے جس کو دن رات سابقہ پیش آتا ہے۔ مولانا مودودی ایسی ہی عورت کے درد کا احساس کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

ایک ناتجربہ کار دوشیزہ ابتدا میں ان فطری تکلیفوں کا اندازہ نہیں کر سکتی جو ایک عنین کی بیوی کو پیش آتی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ اپنی نیک طبعی کی بنا پر یہ خیال کرے کہ شوہر اگر عنین ہے تو کیا ہوا، میں اس کے ساتھ زندگی بسر کر لوں گی، مگر بعد میں ناقابل برداشت تکلیفیں پیش آئیں جن کا اسے پہلے احساس نہ تھا اور وہ اپنی صحت کی خرابی یا مبتلائے معصیت ہونے کے خوف سے پریشان ہو کر تفریق کی خواہش کرے۔ کیا ایسی صورت میں یہ جائز ہو گا کہ اس کی پہلی رضامندی کو سند قرار دے کر اس کی زبان پکڑ لی جائے یا اس کو یہ کہا جائے کہ تو نے ابتدا میں جو غلطی کی تھی اس کی یہی سزا ہے کہ اب تو سڑ سڑ مر جا یا آبرو باختہ ہو کر زندگی گزار۔[۴۹]

۲۔ دوسری بات یہ کہ جب یہ اصول تسلیم کر لیا جائے کہ اجتہادی مسائل میں قضاے قاضی سے مسئلے میں اختلاف ختم ہو جاتا ہے اور ایک راے معین ہو جاتی ہے تو فقہا کے ہاں اس پہ اتفاق ہے کہ ایک مسئلے کی دوسری نظیر میں بھی جب قضاے قاضی ہو جاے گا تو اس میں بھی اختلاف کی گنجائش ختم ہو جائے گی اور اس کے خلاف فتویٰ نہیں دیا جائے گا۔[۵۰] پھر یہ کیسے ممکن ہو گا کہ بعض صورتوں میں تو عدالتوں کا فیصلہ تسلیم کیا جائے اور بعض صورتوں میں اس کی مخالفت کی جائے؟

بظاہر فتوے کے اس رجحان میں بھی عدالتی خلع کے متعلق اس قدر وسعت اختیار کرنے کے باوجود مشکلات کے حل میں تشنگی برقرار ہے۔ دوسری بات یہ کہ اس طرز عمل سے عدالتی فیصلے بھی تماشا بن جائیں گے؛ کبھی نافذ قرار پائیں گئے اور کبھی نہیں۔

۴۹۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، **حقوق الزوجین** (لاہور: ادارہ ترجمان القرآن، ۱۹۹۸ء)، ۷۸۔

۵۰۔ القرافی، **أنوار البروق**، ۲: ۱۰۳۔

چوتھے رجحان کا جائزہ

چوتھے رجحان کا مقصد بھی عدالتی خلع کے سلسلے میں عورت کو درپیش مشکلات کا حل نکالنا ہی ہے۔ ان حضرات کے نزدیک فقہ حنفی، شافعی میں خلع اور تفریق کے سلسلے میں قاضی کے اختیارات محدود ہیں۔ اگر خلع اور تفریق کے باب میں فقہ مالکی کے نقطۂ نظر پر فتوی دیا جائے تو اس سلسلے میں پیش آنے والی مشکلات کا خاتمہ ممکن ہے۔ 'شقاق' یعنی میاں بیوی کی آپس میں ناچاقی کی صورت میں مالکی مذہب پر فتوی دینے کا رجحان مفتی محمد زاہد اور مفتی سیف اللہ خالد رحمانی کا ہے۔ مولانا سیف اللہ خالد رحمانی نے اپنے موقف کی تائید اور مذہب مالکی کی ترجیح کے جو دلائل ذکر کیے ہیں وہ بھی محل نظر ہیں:

مثال کے طور پر:

الف۔ انھوں نے حضرت ثابت بن قیسؓ کی زوجہ کے واقعے سے استدلال کیا ہے جس پر تفصیلی نقد پہلے رجحان کے جائزے میں گزر چکا ہے۔

ب۔ دوسرا انھوں نے حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے دور میں پیش آنے والے خلع کے دو واقعات سے استدلال کیا ہے جو کہ تفصیل کے ساتھ پیچھے گزر چکے ہیں۔ استدلال واضح کرنے کے لیے دوبارہ ان پر نظر ڈالتے ہیں:

۱۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عقیل بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اور فاطمہ بنت عتبہ رضی اللہ عنہا (جو میاں بیوی تھے) کے درمیان اختلاف پیدا ہو گیا۔ فاطمہ رضی اللہ عنہا نے حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ سے شکایت کی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ اور حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کو بحیثیت حکم بھیجا۔ حضرت عبد اللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: لأفرقن بينهما یعنی میں ضرور ان دونوں کے درمیان تفریق کر دوں گا۔ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے کہا کہ میں عبد مناف کے دو بزرگ خاندانوں میں تفریق نہیں کر سکتا۔ (ما كنت لأفرقن بين شيخين من عبد مناف) یہاں تک کہ ان دونوں نے باہم خود ہی مصالحت کر لی۔

۲۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دور کا واقعہ یہ ہے کہ ایک شوہر اور بیوی اپنے اپنے لوگوں کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خدمت میں آئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے شوہر اور بیوی ہر ایک کے لوگوں میں سے ایک ایک حکم منتخب کیے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان دونوں سے مخاطب ہو کر فرمایا کہ تم کو اپنی ذمے

داری معلوم ہے؟ تمھاری ذمے داری یہ ہے کہ مناسب سمجھو تو دونوں میں علاحدگی کرادو۔ عورت نے کہا میں اللہ کی کتاب پر راضی ہوں چاہے اس کا فیصلہ میرے حق میں ہو یا میرے خلاف اور شوہر نے کہا جہاں تک علاحدگی کی بات ہے تو میں اس کے لیے تیار نہیں ہوں۔ (أما الفرقة فلا) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم نے جھوٹ کہا۔ تم بھی جب تک اس عورت کی طرح اقرار نہ کرلو یہاں سے جا نہیں سکتے۔

اس مقدمے میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کا حکمین سے کہنا کہ کیا تم اپنی ذمے داری سے واقف ہو، تمھاری ذمے داری یہ ہے کہ اگر تم چاہو تو علاحدگی کرادو۔ (هل تدريان ما عليكما؟ إن رأيتما أن تفرقا فرقتما) اس بات کی دلیل ہے کہ حکمین بحیثیت حکم تفریق کا اختیار رکھتے ہیں اور وہ اس کے ذمے دار ہیں۔ اگر ان کی حیثیت محض وکیل کی ہوتی تو سوال اس طرح ہوتا کہ کیا تمھیں معلوم ہے کہ تم کس بات کے وکیل بنائے گئے ہو؟ (هل تدريان لماذا وكلتما؟) پھر یہ کہ خلع میں اگر ایک طرف مرد کی رضامندی ضروری ہوتی اور قاضی کو اس سلسلے میں کوئی اختیار نہ ہوتا تو یہ بات بھی درست نہ ہوتی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اس پر طلاق کی آمادگی کے لیے کیسے دباؤ ڈال لیں؟ وہ زیادہ سے زیادہ سفارش اور اپیل ہی کرسکتے تھے۔

دلیل کا جائزہ

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مندرجہ بالا قول مختلف الفاظ کے ساتھ روایت کیا گیا ہے۔ جصاص نے عَبِیدہ[۵۱] سے جو روایت کی ہے اس میں ہے: "لاتنفلت مني حتى تقر كما أقرت"[۵۲] (تم میرے ہاتھوں چھوٹ کر نہیں جاسکتے یہاں تک کہ تم اس بات کا اقرار کرلو جس کا اقرار تمھاری بیوی نے کیا ہے) کے الفاظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حضرت علی خاصی تاکید کے ساتھ خاوند کو یہ بات کہہ رہے ہیں۔ اب اس قدر تاکید اور ناراضی کے اظہار

۵۱- عَبِیدۃ بن عمرو السلمانی، عہد رسالت کے آخری ایام میں مسلمان ہوئے لیکن زیارت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے سرفراز نہ ہوسکے۔ کبار تابعین میں شمار کیا جاتا ہے اور کئی ثقہ تابعین نے آپ سے احادیث روایت کی ہیں۔ آپ کو حضرت علی اور ابن مسعود کے شاگردوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ ابو عمر یوسف بن عبد اللہ بن محمد بن عبد البر قرطبی، **الاستيعاب في معرفة الأصحاب** (بیروت: دار الجیل، ۱۹۹۲ء)، ۳: ۱۰۲۳۔

۵۲- یہ الفاظ ابو بکر جصاص نے احکام القرآن میں عبیدہ کی روایت سے نقل کیے ہیں۔ احمد بن علی ابو بکر جصاص، **أحكام القرآن** (بیروت: دار إحياء التراث العربي، ۱۴۰۵ھ)، ۳: ۱۵۲۔

کے دو سبب ہو سکتے ہیں: ایک تو یہ کہ خاوند اس بات سے انکار کر رہا ہو کہ وہ کتاب و سنت کے مطابق فیصلہ قبول نہیں کرے گا، روایت کے الفاظ اس احتمال کی تائید نہیں کرتے کیوں کہ شوہر نے صرف علاحدگی کا انکار کیا ہے، کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ قبول کرنے سے نہیں۔ دوسرا احتمال یہ ہے کہ حضرت علی کا مقصد یہ تھا شوہر بھی اس بات پر رضامندی کا اظہار کرے کہ حکمین میری طرف سے بھی تفریق یا صلح کے وکیل ہیں۔ بظاہر یہی قرین قیاس بھی لگتا ہے کیوں کہ اگر حضرت علی کا بھی یہی خیال ہوتا کہ حاکم یا قاضی اور اس کے مقرر کردہ حکم کو تفریق کا اختیار ہوتا ہے تو پھر آپ خاوند کو مجبور نہ کرتے۔

نتیجۂ بحث

فتوی کے درج بالا رجحانات میں اگر نصوص اور دلائل کو دیکھا جائے تو تمام مسالک کے دلائل پر کلام اور تاویل کی گنجائش ہے۔ کسی نقطۂ نظر کی بنیاد قطعی الدلالت نصوص پر قائم نہیں، جس سے واضح ہے کہ یہ مجتہد فیہ مسئلہ ہے، اس لیے عدالتی فیصلہ قبول کرکے آگے نکاح کرنے والی خواتین کے فعل کو صریحاً غلط، حرام اور میاں بیوی کے تعلق کو حرام کاری قرار دینے سے گریز کرنا ضروری ہے۔ اگر مقاصد شریعت کی رو سے دیکھا جائے تو چوتھے رجحان میں اعتدال کا پہلو غالب ہے اور اس میں مقاصد نکاح اور مصالح زوجین کی زیادہ رعایت ہے۔ اہم بات یہ ہے کہ اس نقطۂ نظر کے خارج میں سلبی اثرات و نتائج نہیں ہیں۔ اس نقطۂ نظر کو اختیار کرنے کی صورت میں ان خواتین کو بھی فائدہ ہوگا جو واقعتاً مشکل کا شکار ہیں اور ان خواتین کے لیے بھی راستہ ہے جو کسی غلط فہمی یا نادانی کا شکار ہو کر خلع کا فیصلہ کروانا چاہتی ہیں۔

خلع کے حوالے سے اس وقت پورے عالم اسلام کی عدالتوں میں یک سوئی پائی جاتی ہے اور مفتیان کرام کی آرا پاکستان کی طرح بعض دیگر اسلامی ممالک میں بھی جواز اور عدم جواز میں تقسیم ہیں۔[۵۳] فلسطین میں ۲۰۱۲ء تک قدیم اردنی قانون کی پیروی کی جاتی رہی ہے، جس کی رو سے خلع کے لیے طرفین کی رضامندی ضروری تھی۔ اس قانون کی وجہ سے بعض اخباری اطلاعات کے مطابق ہزاروں مقدمات التوا کا شکار تھے۔ آخر کار مجبور ہو کر فلسطینی چیف جسٹس نے ۲۰۱۲ء میں وہی فیصلہ کیا، جو کئی دہائیاں پہلے پاکستانی سپریم کورٹ دے چکی ہے۔[۵۴] اسی

53– http://www.youm7.com/story/1827504/84%209/8/2014.

54- http://www.raya.ps/ar/topics/819849.html.

طرح وہ ممالک جہاں خلع کا فیصلہ زوجین کی باہمی رضامندی کے بغیر قانونی طور پر درست نہیں مثلاً عراق،[۵۵] شام،[۵۶] کویت[۵۷] اور مراکش[۵۸] وغیرہ وہاں بھی میاں بیوی میں ناچاقی کی صورت میں عدالت کو تحکیم کا طریقہ اختیار کرتے ہوئے تفریق یا صلح کا پابند بنایا گیا۔[۵۹] گوکہ پاکستانی عدالتوں میں خلع کے مقدمات میں مدعی اور عدالت حوالے سے بے اعتدالی کے واقعات اور شکایات موجود ہیں اور اس نوع کی شکایات مصر اور مراکش اور اردن وغیرہ جیسے ممالک میں بھی موجود ہیں جہاں خلع کا مرتب قانون موجود ہے اور اس میں کئی طرح کی احتیاطوں کو بھی ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اس حوالے سے نظام میں بہتری کی ضرورت ہے، لیکن بظاہر اس سلسلے میں فتوے کے بجاے عدالتی نظام میں بہتری اور اصلاحات کی ضرورت ہے جس کے لیے مقننہ اور عدلیہ سمیت مفتیان کرام کو بھی اپنی بساط بھر کردار ادا کرنا چاہیے۔

تجاویز

اس حوالے سے چند تجاویز درج ذیل ہیں:

۱– جج حضرات کو اس پر قائل کیا جائے کہ وہ بے شک خلع کے مقدمات کو تیز رفتاری سے نمٹائیں، لیکن ۲۰۰۲ء میں ہونے والی ترمیم میں مصالحت کا باقاعدہ کوئی طریق کار وضع نہیں کیا گیا، اس لیے ۱۹۶۱ء کے مسلم عائلی قوانین میں نکاح کے ختم کرنے کے سلسلے میں ثالثی کونسل کا جو طریق کار[۶۰] ذکر کیا گیا ہے، اس کو سنجیدگی سے اختیار کرلیا جائے؛ اس حوالے سے پاکستانی اور مصری قانون میں بہت مماثلت ہے،

۵۵– ملاحظہ ہو: قانون التعديل الثاني لقانون الأحوال الشخصية، دفعہ ۴۶، (عراق: مجموعة القوانين والأنظمة، ۱۹۷۸ء)، ۱: ۳۱۴۔

۵۶– **قانون الأحوال الشخصية**، دفعہ ۹۵، (شام: ملتقى القانون السوري)، ۱۶۔

۵۷– **قانون الأحوال الشخصية**، دفعہ ۱۳۰- ۱۳۱، (کویت: وزارة العدل، ۲۰۱۱ء)، ۸: ۴۰۔

۵۸– **مدونة قانون الأسرة**، ۹۴- ۹۷، (مراکش: وزارة العدل، ۲۰۱۶ء)، ۳۱۔

۵۹– **قانون التعديل الثاني لقانون الأحوال الشخصية**، دفعہ ۴۱-۴۲؛ **قانون الأحوال الشخصية**، دفعہ ۱۱۲- ۱۱۵، ۱۶۔

60– THE WEST PAKISTAN FAMILY COURTS ACT, 1964.

بلکہ پاکستانی قانون میں احتیاط کو زیادہ ملحوظ رکھا گیا ہے۔ جہاں خلع کا مقدمہ دائر کرنے سے پہلے بیوی ثالثی کونسل میں درخواست دے، وہاں اگر صلح نہ ہو سکے تو عدالت کی طرف رجوع کیا جائے اور عدالت بھی پابند ہے کہ کیس کی سماعت سے پہلے صلح کی کوشش کرے، حکمین کے ذریعے یا خود ہی اگر اس میں کام یابی نہ ہو تو فیصلہ سنائے جانے سے پہلے ایک بار پھر کوشش کی جائے اور ناکامی کی صورت میں فیصلہ سنایا جائے۔[۶۱]

۲۔ عام طور پر عدالت کی طرف سے خلع اور فسخ نکاح میں فرق نہیں کیا جاتا، جس کی وجہ سے زیادہ مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اگر عدالت جس مقدمے میں فسخ نکاح کی وجوہات پائی جا رہی ہوں، وہاں شرعی طریق کار کے مطابق فسخ کا فیصلہ کر دے تو آدھے سے زیادہ مسائل ویسے ہی حل ہو جاتے ہیں۔ اس حوالے سے ججوں کی رہ نمائی کی ضرورت ہے۔

۳۔ اسی طرح وکیلوں کی رہ نمائی اور تربیت بھی ضروری ہے، کیوں کہ زیادہ تر معاملات وکلا کے چیمبر میں خراب ہوتے ہیں جہاں آنے والے موکلین کو یہ نصیحت کی جاتی ہے کہ وکیل سے سچ سچ بولیں اور عدالت میں کوئی بات سچ نہ کہیں۔ اس سلسلے میں مراکز افتا اور خاص اس مقصد کے لیے قائم کردہ اداروں کو اپنا دائرہ کار وسیع تر کرنے کی ضرورت ہے۔

۶۱۔ تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو: محمود سرطاوی، **شرح قانون الأحوال الشخصية** (عمان: دار الفکر، ۲۰۱۰ء)، ۲۹۹-۳۰۲۔